© rasailojaraid.com

تاریخی حقائق

از

(جناب مولانا محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی)

دار العلوم معینیہ ساکھر ضلع مونگیر

علی گڈھ میگزین نے اس سال علی گڈھ نمبر نکالا، سنا تو مجھے بھی پڑھنے کا شوق ہوا، حسن اتفاق سے مرے اس شوق کی خبر "ہمارے ادب رکھتے ہوئے دوست" سید علی امام صاحب (علیگ) کو ہو گئی، دو سالہ خفگی اور ترک تعلقات کے عزم محکم کے باوجود انھوں نے لطف و کرم ہی سے کام لیا، اور "علی گڈھ نمبر" مرے پاس پہنچ گیا۔ ——— میں نے اسے پڑھا، پڑھتے وقت کچھ خاص واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا، ان پر نشان ڈالتا گیا، آج انھی میں سے چند واقعات مندرجہ بالا عنوان سے حاضر خدمت ہیں اگر ان تاریخی حقایق سے کسی صاحب کو کوئی فائدہ پہنچے تو وہ سید صاحب کا شکریہ ادا کریں۔ (ظفیر صدیقی)

سر سید احمد خاں بانی علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کو علمی دنیا میں جو شہرت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں، ان کے مذہبی خیالات کے متعلق لوگوں میں بلاشبہ مختلف رائیں ہیں مگر جہاں تک اپنی معلومات کا تعلق ہے ان کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ ان کے اخلاص و للہیت کے باب میں دو رائیں نہیں ہو سکتی ہیں۔

مولانا حالی مرحوم لکھتے ہیں

"جب سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" چار جلدوں میں چھپ کر ہندوستان پہنچی، جس کی نسبت عیسائیوں میں مشہور تھا کہ اس نے اسلام کے استیصال میں تسمہ لگا نہیں رکھا، اس وقت جو حال سر سید

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی بے چینی اور جوش و خروش کا تقاضہ ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔[1]

اللہ اللہ یہ حال ہے اس مسلمان کا جس کو کہا جاتا ہے کہ بعض مصالح کی بنیاد پر انگریزی حکومت اور خود انگریزوں سے بڑا خاصا تعلق تھا تعلقات اپنی جگہ تھے، مگر دین کے معاملہ میں دیکھ رہے ہیں کتنے بے چین ہیں اور کیسا ان میں جوش و خروش ہے آج ان کا نام لینے والے ہر معاملہ میں ان کا بار بار حوالہ دیں گے، مگر جہاں دین کی بات ہو، وہاں ان کا سارا حسنِ ظن رکھا کا رکھا ہی رہ جاتا ہے۔ اور ان میں کوئی بے چینی پیدا نہیں ہوتی ——— مولانا حالی مرحوم ہی کا بیان ہے

"وہ (سرسید) جب کبھی اور کاموں سے فارغ ہو کر بیٹھتے تھے، اکثر سر ولیم کی کتاب کا ذکر کرتے تھے، اور نہایت افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ اسلام پر حملے ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کو مطلق خبر نہیں۔"[2]

اس کو بار بار پڑھیے اور سوچیے، سرسید مرحوم میں کتنی اور کیسی غیرت و حمیتِ دینی پائی جاتی تھی مگر آہ ان کے نام لیواؤں میں اب یہ غیرت و حمیت دینی کہاں نظر آتی ہے؟ جو دو چار ہیں اُن کو کوئی پوچھتا ہی نہیں، بلکہ اب تو خود اسی یونیورسٹی کے فرزندانِ ارجمند اپنی اسی یونیورسٹی میں بیٹھ بیٹھ کر سر ولیم سے زیادہ سخت حملے کرتے رہتے ہیں، اور ان کو احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ تیر کس کا دل زخمی کر رہا ہے، اور کس کے کلیجہ کو چھید رہا ہے۔

سرسید مرحوم اپنے ایک خط میں اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں

"ان دنوں ذرا میرے دل کو سوزش ہے ولیم میور صاحب نے جو کتاب آنحضرت صلعم کے حال میں لکھی ہے اس کو میں دیکھ رہا ہوں، اس نے دل کو جلا دیا، اور ان کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا۔"[3]

یہ اس شخص کی گواہی ہے جو جدید تعلیم یافتوں کا امام ہے، کیا اس کے بعد بھی یقین نہ ہوگا کہ عیسائیوں نے مذہب اور دین کی باتوں کے بیان کرنے میں بڑی ناانصافیاں کی ہیں، بے جا تعصب سے کام لیا ہے، جن جدید تعلیم یافتوں کے دینی معلومات کا بیشتر ذخیرہ انگریزوں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں، ان کو سوچنا چاہیئے، کہ ان کے "دینی معلومات" کی حیثیت پھر کیا رہ جاتی ہے؟

---

[1] علی گڑھ میگزین علی گڑھ نمبر ص۹۵ [2] ایضاً [3] علی گڑھ نمبر ص۹۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ولیم میور وغیرہ نے کتنی گندگی اُچھالی ہوگی، کہ سر سید مرحوم کے قلم سے یہ جملے ٹپک پڑے۔

"مصمم ارادہ کرلیا کہ آنحضرت صلعم کی سیرت میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا، کتاب لکھ دی جائے، اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے، اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے، قیامت میں یہ کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر فقیر ہو کر مرگیا حاضر کرو ع

"مارا ہمیں تمغۂ شہنشاہی بس است"[1]

اللہ اللہ یہ ہے محبتِ رسول، اور حمیت دین کا جذبہ، کہاں ہیں وہ لوگ۔ جو سر سید کا نام لے کر اپنی بڑائی جتاتے ہیں اور ان کی غیرت وحمیت جواب دے گئی ہے، وہ ہر جائز ناجائز شعبہ میں تو خرچ کر سکتے ہیں، مگر دین کی عزت وعظمت کی خاطر ایک پیسہ خرچ کرنا جرم سمجھتے ہیں، حد یہ ہے کہ اس سلسلہ میں زبان کھولنے کی بھی ان کو جرأت نہیں ہوتی، دماغی عیاشی کے لئے سیکڑوں ناول اور ڈرامے لکھ سکتے ہیں مگر دین کی عظمت اور اس کی سربلندی کے لئے ایک جملہ لکھنے میں بھی شرم محسوس کرتے ہیں، اور سوچتے ہیں اس کا کیا معاوضہ ملے گا۔

سر سید مرحوم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کئے گئے اعتراض کا صرف جواب ہی نہیں لکھا، بلکہ اس کے چھپوانے کی صورت بھی خود ہی سوچی، اور کتابت وطباعت کے اخراجات کی خود ہی فکر کی، اس سلسلہ میں سید مرحوم لکھتے ہیں۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ اس خط کے پہنچنے کے بعد میر ظہور حسین کے پاس جائیں ۔ ۔ ۔ ۔ اور دونوں صاحب مل کر کسی مہاجن سے ہزار روپیہ قرض لیجئے، سود اور روپیہ میں ادا کردوں گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہزار روپیہ بھیجنے کے لئے دلی لکھا ہے اور میں نے لکھا ہے کہ کتابیں اور مرا اسباب یہاں تک کہ مرے ظروف مستی تک فروخت کرکے ہزار روپیہ بھیج دو۔"[2]

اس وقت سودی لین دین کی بحث چھوڑیئے۔ اور ایمانداری سے سید مرحوم کے بے پناہ ایمانی جذبہ اور دینی غیرت وحمیت کا اندازہ لگایئے، اور دیکھئے ان کے جوش وخروش کا کیا عالم ہے

---

[1] علی گڈھ نمبر ص۹۹ [2] ایضاً ص۱۰۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور وہ کس قدر بے چین ہیں، اور لندن میں بیٹھ کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کا کیسا حق ادا کر رہے ہیں، اس سلسلہ میں نہ انگریزوں کے علوم وفنون سے مرعوب ہوتے ہیں اور نہ حکومتِ وقت سے خوف زدہ۔

آہ جس یونیورسٹی کے بانی کے ایمان وعمل کا یہ حال ہے، آج اس ادارہ کے فیض یافتوں کی ذہنی حالت قابلِ صد افسوس ہے دنیاوی لحاظ سے بلاشبہ یہ بہت اونچے، بلند خیال، بلند اقبال اور ہر طرح قابلِ مدح وستائش ہیں، مگر جہاں تک دینی غیرت وحمیت اور ایمان وعمل کا تعلق ہے، اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ بجز چند افراد بانیِ ادارہ کے ساتھ ان کو کوئی خاص گرویدگی نہیں، کاش لوگ سوچتے کہ بانیِ ادارہ کا مقصد جہاں دنیا کے اونچے عہدے حاصل کرنا تھا، وہاں یہ بھی مقصد تھا کہ مسلمان ان اونچے عہدوں پر رہ کر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی خدمت انجام دیں، اور اس دین پر جہاں سے زد پڑ رہی ہو۔ اس کا دروازہ بند کرنے کی سعی کریں۔

سرسید مرحوم میں جس طرح دینی غیرت تھی، اسی طرح آپ کو مسلمان اور مسلمانی تاریخ سے محبت تھی، چنانچہ کوئی مؤلف ومصنف اگر اپنی کتابوں میں مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کرتا اور آپ کو معلوم ہوجاتا تو برداشت نہیں کرتے تھے اس سلسلہ میں آپ نے ایک مرتبہ محسن الملک کو لکھا۔

"انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت ناانصافی اور تعصب سے لکھی ہیں اور کوئی برائی نہیں ہے، جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کی ہو"[۱]

کہاں ہیں انگریز مصنفوں کے کلمہ گو! آنکھیں کھول کر دیکھیں سید مرحوم جیسے روادار اور انگریز دوست کا کیا خیال ہے یہ کوئی دیوبندی مولوی کا بیان نہیں، بلکہ مسلم یونیورسٹی کے بانی کی تحریر ہے، علیگ بھائی بھی اسے غور سے پڑھیں، جو انگریز مصنفوں کی تاریخوں پر بغیر کافی تحقیق یقین کرلیتے ہیں، اور بے چارے مسلمان محقق مصنفوں کو اپنے خیال میں کوئی وقعت نہیں دیتے، اور حد یہ ہے کہ فارسی، عربی اور اردو صحیح تاریخوں کا پڑھنا ان کو بار گذرتا ہے۔

---

[۱] علی گڈھ میگزین علی گڈھ نمبر ص۱۰۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انگریز مصنفوں کی بے ایمانی کا راز فاش کرنے کے بعد سر سید مرحوم آگے رقمطراز ہیں

"ہماری قوم کے جوان لڑکے انگریزی میں انھیں تاریخوں کو پڑھتے اور دیکھتے ہیں، جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہے اور جو بات ازراہِ ناانصافی اور تعصب مسلمانوں کی نسبت لکھی گئی ہے، اس کو وہ سچ اور واقعی سمجھتے ہیں"[1]

جس خطرہ کی طرف اشارہ کیا گیا تھا، افسوس آج تک اس خطرہ کا تشفی بخش انسداد نہ ہو سکا سر سید مرحوم نے جس زہر سے مسلمان بچوں کو بچانا چاہا تھا، بعد میں چل کر اس کے ماننے والوں کو اس کا صحیح احساس باقی نہ رہا۔

علیگ برادری نے جتنا دھیان ناول اور افسانے پر دیا، کاش یہ اس کا کوئی ادنیٰ حصّہ تاریخ پر صرف کرتے، تو آج اردو میں صحیح تاریخوں کا بڑا ذخیرہ ہوتا، گو اب بھی اردو میں صحیح تاریخوں کی کمی نہیں، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا کرے نظامِ حیدرآباد کو، جس کی علم دوستی کی بدولت بہت سی عربی تاریخیں اردو میں منتقل ہو سکیں۔

لندن میں رہ کر سر سید مرحوم ایک ایک چیز کو عبرت و بصیرت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور مسلمانوں کی حالت پر آنسو بہاتے ہیں، ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"مگر ہماری قسمت میں وہی جلنا ہے، یہاں کا حال دیکھ دیکھ کر اپنے ملک اور اپنی قوم کی حمایت اور بے جا تعصب اور تنزلِ موجودہ اور ذلت آئندہ کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا ہے"[2]

جو اپنی قوم کو کہیں نہیں بھولتا، دوسروں کی ترقی دیکھ کر اپنی قوم کے تنزل پر آنسو بہاتا ہے، اور ان اسباب کو تلاش کرتا ہے جن کی وجہ سے قوم پامال ہو رہی ہے ———— دنیا سن کر سکتہ میں آ جائے گی کہ آج ان کے نام لیواؤں کی بڑی جماعت بے حسی کی زندگی گذار رہی ہے، اور غفلت کی نیند سوتی ہے، آج اس جماعت کے پیشِ نظر صرف اپنا ذاتی فائدہ ہے اور بس،

یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سب کے سب ایسے ہی ہیں، بلکہ وہ باکمال اور حساس افراد بھی ہیں جو رات دن قوم کی خیر خواہی میں دل و جان سے منہمک ہیں۔

---

[1] علی گڑھ میگزین علی گڑھ نمبر صفحہ ۱۰۳ [2] ایضاً صفحہ ۱۰۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سرسید مرحوم نے مسلمانوں کی اسی حالت کا ماتم کیا ہے

"افسوس کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کا نکالنے والا نہیں ہے، ہائے افسوس امرت تھوک دیتے ہیں، اور زہر نگلتے ہیں، ہائے افسوس ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں، اور مگر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔"[1]

مگر آہ کس کو بتایا جائے کہ تم جہاں جا رہے ہو، وہاں کھرے سکّے نہیں ملتے، کھرے سکوں کی تلاش ہو تو ہمت سے کام لو، مرعوب ہونا ترک کرو، بہادر اور نڈر بنو، اور اپنے ملک و قوم کی خیر خواہی میں لگ جاؤ، نتیجہ خدا کے ہاتھ ہے، تمہارا کام جد و جہد کرنا اور قوم کو راہِ راست دکھانا ہے، سرسید مرحوم نے ایک مرتبہ وقار الملک کو لکھا تھا۔

"میں قسمیہ آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے مسلمانوں کی بہتری، ترقی اور درستی اخلاق کی جس پر میں کوشش کر رہا ہوں مطلق توقع نہیں ہے مایوسیِ محض ہے مگر اس خیال سے کہ ہمارا فرض کوشش کئے جانا ہے کرتا ہوں بس جس چیز کے حصول سے مایوسی ہو، اس مایوسی کے سبب سے اپنا فرضِ کوشش ترک نہیں ہو سکتا۔"[2]

یہ ہے اپنے فرض کا احساس، آج جدید تعلیم یافتوں کو کون بتائے کہ آپ کی ذمہ داری بھی بڑی اہم ہے، مگر آپ کو احساس نہیں، آپ بس پڑھنا اور پڑھ کر کمانا ہی اپنا فرض سمجھتے ہیں، یہ محض غلط ہے، صرف مولویوں کو ہر چیز کا ذمہ دار قرار دے کر مطعون کرنا یہ ذمہ داری کا احساس نہیں ہے، آزاد ہندوستان میں دینی جذبہ لے کر آگے بڑھنے اور قومی خدمت کی بڑی گنجائش ہے۔

جو لوگ سمجھتے ہیں کہ سرسید عربی فارسی کے بالکل خلاف تھے وہ بالکل غلط ہے اسی طرح ہمارے علیگ بھائیوں میں جن کا یہ خیال ہے کہ عربی فارسی کی کوئی اہمیت ہی نہیں وہ بھی بھول میں ہیں سرسید مرحوم نے ایک بار عماد الملک کو لکھا تھا

"اسی کے ساتھ یہ تدبیر بھی چاہتا ہوں کہ علوم عربیہ اور درس کتب مذہبی جو معدوم ہوتا جاتا ہے، کسی طرح قایم رہے، اگر عربی فارسی ہم میں سے معدوم ہو جائے۔ تو اسی کے ساتھ ہماری قومیت بھی معدوم ہو جائے گی"[3]

---

[1] علی گڈھ نمبر ص ۱۰۱ [2] ایضاً [3] ایضاً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آہ اب یہ خیال کس کو ہے؟ کہ مذہبی تعلیم اور جس زبان میں اس کا ذخیرہ ہے اس کا حاصل کرنا بھی ضروری ہے، اور اس سے غفلت موت کے مرادف ہے، آج عربی داں جب تک جدید تعلیم حاصل نہ کرے اور انگریزی داں جب تک علوم مشرقیہ اور دینی معلومات حاصل نہ کرے۔ اس کا علم ادھورا ہے، تنگ نظری دونوں ہی میں باقی رہ جاتی ہے، کاش لوگ غور کریں

سرسید مرحوم ایک زندہ دل اور با اخلاق انسان تھے، اور ان کا مطمح نظر، نیکی کرنا اور برائی دور کرنا تھا، خود فرماتے ہیں:۔

"ہم کو خدا نے دنیا میں اس لئے پیدا کیا ہے کہ سب کی بھلائی چاہیں، برا کرنے والے کی برائی سے ہم کو کیا کام، ہم کو اپنا دل، اپنی زبان بھلی رکھنی چاہیئے، بدوں یا بدطینتوں پر افسوس کرنا چاہیئے، مگر اس سے زیادہ کچھ کرنا خود اپنے کو بھی ویسا ہی کرنا ہے، جو لوگ برا کہنے والے ہیں، اُن کی نسبت ہم کو صبر و تحمل چاہیئے، اگر وہ برائی ہم میں ہے، تو اس کے دور کرنے میں کوشش لازم ہے"[1]

یہ ہیں ہمارے گذرے ہوئے بزرگوں کے اخلاق و اعمال، برائی ان کے وہم میں بھی نہیں آتی تھی، بس نیکی ہی نیکی ان کے مد نظر رہتی، برائی کا جواب بھی نیکی ہی سے دیا کرتے تاکہ برائی دور ہو، اب یہ اخلاق و اعمال اور صبر و تحمل ہم لوگوں میں کہاں باقی رہا؟ جو لوگ آپ سے روحانی وابستگی رکھتے ہیں ان کو سوچنا چاہیئے، کہ ہمارے اخلاق و اعمال کیوں کر سدھر سکتے ہیں۔

بانئ علی گڈھ کا دل میل کچیل اور کینہ کپٹ سے پاک تھا، ایک دفعہ محسن الملک کو ان کے خط کے جواب میں لکھا:۔

"مولوی س-خ کو اب بھی میں اپنے بھائی سے کم نہیں سمجھتا، مگر جو ملال کہ مرے دل میں ہوا، وہ اب تک کم نہیں ہوا، پھوٹ جاوے وہ آنکھ، جو کسی کو دیکھے اس نگاہ سے، جو اس کے دل میں نہیں ہے، گل جاوے وہ زبان، جو وہ کہے جو اس کے دل میں نہیں ہے، اور ٹوٹ جاوے وہ ہاتھ، جو وہ لکھے جو اس کے دل میں نہیں ہے"[2]

---

[1] علی گڈھ نمبر ص۱۰ [2] ایضاً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیکھ رہے ہیں منافقت سے بےزاری کا اعلان، اور اخلاصِ عمل کا اظہار، اب تو اس نیکی کو لوگ بے وقوفی کہتے ہیں، وہ بڑا گدھا سمجھا جاتا ہے جس کا عمل دل کے مطابق ہو، اب کمال یہ ہے کہ دل میں کٹاری ہو، اور زبان شیریں، دل میں بُرائی ہو، اور زبان پر تعریف، علیگ برادری اپنے بانی کی اس تحریر کو بار بار پڑھے اور سوچے کہ کیا ہمارا طرزِ عمل یہی ہے، جس کی بانی یونیورسٹی تعلیم دے گئے ہیں۔

سرسید مرحوم کو اپنی قوم سے بڑی ہمدردی تھی، اور قوم و ملّت کا غم اتنا غالب تھا کہ وہ اپنا سارا غم فراموش کر گئے تھے، ایک موقع سے انھوں نے ایک انگریز مسٹر شکسپیر کی مدد کی تھی، اس مدد کے سلسلہ میں ان کو ایک جاگیر دینا چاہا، مگر انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، خود لکھتے ہیں

"جب ہمارے دوست مرحوم مسٹر شکسپیر نے جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک بعوض اس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نہایت نامی خاندان کی ملکیت تھا اور لاکھ روپے سے زیادہ کی مالیت کا تھا، مجھ کو دینا چاہا، تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا، میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہوگا، کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو، اور میں ان کی جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں میں نے اس کے لینے سے انکار کیا۔"[1]

اللہ اللہ یہ تھا دردِ دل قوم و ملّت کے باب میں، ایک لاکھ کی جاگیر پر لات مار دی اور اپنی غیرت و حمیّت کی لاج رکھ لی، سوچا جائے اب ایسے لوگ کہاں باقی رہے ہے؟ اب تو لوگ کوشاں ہوتے ہیں کہ کسی کی گردن مروڑ کر ہم اس کی جائداد پر قابض ہو جائیں۔

کہاں ہیں وہ بااثر حضرات، جو رات دن دوسروں کے برباد کرنے کی فکر میں رہتے ہیں اور اپنی ادنیٰ کمائی کی بڑی قیمت مانگتے ہیں، چاہے دوسرے کے بال بچّوں کی لاشوں کو روند کر ہی کیوں نہ حاصل ہو، اس واقعہ سے سبق حاصل کریں۔

۱۸۵۷ء میں بہت سے لوگ بددل ہو کر ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے، حالات دیکھ کر سرسید مرحوم کو بھی پہلے خیال آیا یہی خیال آیا کہ ہندوستان چھوڑ دیں، مگر حالات کا جب انھوں نے گہری نظر سے مطالعہ

---

[1] علی گڑھ نمبر ص ۱۱۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا تو سمجھ میں آیا کہ مرا خیال غلط ہے، چنانچہ خود لکھتے ہیں:۔

"یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے، کہ اپنی قوم کو تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں اس کے ساتھ مصیبت میں رہنا چاہیئے اور جو مصیبت پڑی ہے، اس کو دور کرنے میں ہمت باندھنا قومی فرض ہے، میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔"[1]

اسے کہتے ہیں اپنی قوم سے سچی ہمدردی، اپنا آرام دیکھ کر پوری قوم کو بھول جانا کسی قومی لیڈر کا کام نہیں ہو سکتا، کسی اور کا ہو تو ہو سکتا ہے، مگر آہ اسی بوڑھے سپاہی کی یونیورسٹی کے وہ بلند اقبال فرزندانِ ارجمند، جو کل تک ہندوستان میں تھے، مگر جوں ہی پاکستان میں ان کو اطمینان بخش جگہ ملی یہاں سے بھاگ گئے، یہ بھی نہ سوچا کہ اس یونیورسٹی کا کیا ہوگا، کل تک جن غریب عوام مسلمان کا نام لے کر ہم نے لیڈری اور برتری حاصل کی ہے، اس کا کیا حشر ہوگا، یہی نہیں بلکہ جب موقع آیا تو بے دردی سے مسلمانوں کو آگ و خون کی بارش میں ڈھکیل دیا، اور خود ہوائی جہاز پر بیٹھ کر اڑ گئے، خدا جزائے خیر عطا کرے ان لیڈرانِ عظام اور علمائے کرام کو، جنہوں نے جان کی بازی لگا کر اس دہکتے جہنم میں مسلمانوں کی جان بچائی، اور ساری مصیبتوں سے دوچار ہو کر اب تک یہاں ڈٹے ہیں، اور قوم و ملک کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

مسٹر محمود جو سر سید کے فرزند ارجمند ہیں، بہت ذہین، حاضر الذہن اور دور اندیش تھے، چنانچہ جسٹس محمود کا فیصلہ مدلل و مکمل ہونے میں جو شہرت رکھتا ہے، وہ کسی باخبر سے پوشیدہ نہیں، ان کے متعلق بیان ہے کہ ان کے دل میں خدا کا خوف بہت تھا، ملازمت سے سبکدوش ہو کر جب پنشن پانے لگے، تو قرآنِ پاک اپنے خاص انداز میں پڑھتے اور روتے جاتے تھے، شیخ ممتاز حسین نے لکھا ہے

"گرمی کے موسم میں ایک صبح کو یہ دیکھا گیا کہ سکندر باغ (لکھنؤ) کے سبزہ زار پر پلتھی مار کر محمود صاحب بیٹھے زبانی کچھ پڑھ رہے ہیں، ان کے یہاں رہنے والے ایک صاحب سے یہ معلوم ہوا، کہ ان کو قرآن شریف

---

[1] علی گڑھ نمبر صفحہ ۱۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا ایک پارہ زبانی یاد ہے، کچھ دنوں سے اکثر یہ صبح کو تنہائی میں رب العالمین کا دھیان دل میں رکھ کر اسے پڑھتے ہیں، اور اس کے بعد چند اشعار دنیا کی بے ثباتی کے جو انھیں یاد ہیں پڑھ کر رو دیتے ہیں ——

میں صبح کو ٹہلنے نکلا تھا دور سے میں نے خود یہ سماں ایک بار دیکھا کہ محمود صاحب آنکھیں بند کئے کچھ پڑھ رہے ہیں اور آنکھوں سے آنسو رواں ہیں"[1]

یہ ایک انگریزی داں کا صحیح واقعہ ہے، جو اپنے علم وعقل، اور فہم وتدبر میں مسلم ہے، غور کیجئے اللہ کے بندہ پر اپنے آقا اور مالک کا کیسا خوف تھا، یہ کوئی ملا نہیں تھے، بلکہ لندن کے پڑھے ہوئے اور اپنے وقت میں بڑی شہرت وعزت کے مالک، آہ اب تو ہمارے انگریزی دانوں کو قرآن سے لگاؤ ہی نہیں باقی رہا، اب تو اکثریت انھی لوگوں کی ہے جنہوں نے کبھی قرآن پاک پڑھا ہی نہیں ہے" بس سنتے چلے آرہے ہیں، خشیت الٰہی دلوں میں اب کہاں پیدا ہوتی ؟ اب تو جو لوگ اپنے کو مہذب ومتمدن کہتے ہیں، ان کی دنیا ہی اور ہے، بعض بوڑھے ہونے پر بھی موت کی تیاری نہیں کرتے، کہ قیامت میں ذلت ورسوائی سے رستگاری ہو سکے، اس باب میں عالموں کا حال بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں ہے۔

مولوی بشیر الدین (اٹاوہ) پہلے سرسید کے مخالفوں میں تھے، ان کا بیان ہے کہ "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کے چوتھے اجتماع میں میں نے ایک تجویز پیش کی، اور اس پر ایک زوردار تقریر کی، تجویز یہ تھی کہ ڈبلی نورس کی "تاریخ ہندوستان" جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو مسخ کر کے اہانت آمیز انداز میں پیش کیا گیا ہے، نصاب سے حکومت خارج کردے۔

مولوی بشیر الدین صاحب فرماتے ہیں کہ اس تجویز پر

"سرسید بولنے کھڑے ہوئے تو عالم ہی کچھ اور تھا، ایک ایک لفظ میں دینی حرارت سمائی ہوئی تھی، اور جوشِ اسلامی کا دریا تھا جو اُمنڈ رہا تھا، میں کچھ ہکا بکا سا رہ گیا . . . . اور مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ یہ شخص ناموسِ اسلام کا سچا محافظ، دینِ رسالت مآب کا سچا پیرو، اور قوم کا سچا ہمدرد ہے"[2]

---

[1] علی گڈھ نمبر ص ۲۲۵ [2] ایضاً ص ۲۲۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ ایک ناقد اور مخالف کی گواہی ہے، اس کے بعد سرسید کے اخلاص پر شبہ کرنا ظلم ہوگا، غور کیجئے اس مردِ مسلمان کے دل میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی محبت تھی، اور آپ کی تعلیمات سے اس کو کتنا عشق تھا، آہ اب مہذب اور متمدن کہے جانے والوں میں دین کی یہ عظمت کہاں باقی رہی؟ اب تو کچھ لوگ آپ کے نام کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہیں نکلتے، "محمد صاحب" کہا کرتے ہیں، اور ان کو احساس تک نہیں ہوتا کہ ہم ادب کے طریقے کو چھوڑ کر گستاخی کر رہے ہیں، اور اگر کسی مصلحت وقت کی وجہ سے زبان پر دین کا نام آتا بھی ہے، تو دل پر اس کا اثر نہیں پڑتا۔

مولوی بشیر صاحب ہی کا بیان ہے کہ سرسید کسی کو دبانا نہیں چاہتے تھے، ہر ایک کو اپنی رائے کے اظہار کا موقع دیتے، اور پھر اپنا نقطۂ نظر بہت نرمی سے پیش کرتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں:-

"سرسید میں لاکھ روپیہ کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے ہر نیاز مند کو کھل کر بات کرنے کا موقع دیتے تھے،..

.... جس مخالف کے متعلق ان کو محسوس ہوتا تھا کہ وہ سچائی کے ساتھ ان کے مشن کی مخالفت کر رہا ہے اس کی مخالفت کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور بڑے اہتمام سے تسکین بخش انداز میں اس کے اعتراضات کے جوابات دیتے تھے"[1]

اب یہ اندازِ فکر اور یہ اخلاق ہمارے مہذب دوستوں میں کہاں باقی رہا؟ اب تو کوئی اپنے نقطۂ نظر کے خلاف ایک بات بھی سننے کے لئے تیار نہیں، چاہے کہنے والا کتنا ہی مخلص کیوں نہ ہو، پچھلے دنوں ہر شخص نے مشاہدہ کیا کہ یہ متمدن طبقہ اپنے مخالفوں کی بات سننے سے کتراتا تھا، اور موقع پاکر غنڈوں سے پٹوانے میں بھی ان کو عار نہ ہوتا تھا، بلکہ وہ سمجھتا تھا یہی اعمال و اخلاق کا قانون ہے کاش بانی علی گڈھ کی زندگی کے اس پہلو کو غور سے پڑھتے اور سبق حاصل کرتے۔

مولوی بشیر صاحب فرماتے ہیں

"ایک بار میں نے ان سے کہا کہ آپ نے مسلمانوں میں جدید تعلیم رائج کرنے کا جو کام شروع کیا ہے یہ تو بہت اچھا ہے یہ تبایئے کہ مذہبی معاملات کو کیوں چھیڑ دیا، ..... ہنسے اور فرمایا کہ بھائی اگر میں یہ سوال

---

[1] علی گڈھ نمبر ۲۴۳ و ۲۴۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہ چھیڑتا، تو مسلمان کبھی کالج کی طرف توجہ نہ کرتے۔"[1]

اس واقعہ سے کتنی سچائی ٹپکتی ہے، معلوم ہوتا ہے سرسید دل کے بہت صاف، اور دماغ کے سلجھے ہوئے آدمی تھے، جھوٹ اور فریب کو برا جانتے تھے، اب تو لوگ ایک غلط بات کے لئے سو جھوٹ بولتے ہیں، اور لفاظی سے اسے صحیح ثابت کرنے کی خواہ مخواہ سعی کرتے ہیں، چاہے ان کو اس سلسلے میں ذلت و رسوائی سے دوچار ہی کیوں نہ ہونا پڑے۔

علی گڈھ مدرسہ کی بنیاد پہلے پہل مولوی سمیع اللہ مرحوم نے ۱۸۷۵ء میں رکھی، اس وقت سرسید بنارس میں تھے، مگر اس کی باضابطہ بنیاد ۱۸۷۷ء میں رکھی گئی، اور اس میں مولوی سمیع اللہ کے ساتھ سرسید بھی شریک تھے، اس افتتاح کا ایک مؤثر واقعہ مولوی بشیر صاحب بیان کرتے ہیں جو خود مولوی سمیع اللہ نے ان سے بیان کیا تھا۔ کہتے ہیں

"خود مولوی سمیع اللہ نے مجھ سے بیان کیا، کہنے لگے "میں اور سرسید نماز تہجد کے وقت اٹھ کر میدانِ تعمیر میں گئے، سہانا روح پرور وقت، فضا کی خاموشی، طبیعتوں میں قومی ہمدردی، اور دینی حمیت جوش زن، ایک عجیب کیفیت طاری تھی، سرور انگیز بھی تھی، رقت آمیز بھی، اور عبرت خیز بھی، مغلیہ سلطنت کی تباہی کے بعد ارضِ ہند پر ملت اسلامیہ کی یہ پہلی بنائے تعمیر تھی، زندگی اور ترقی کے خواب کی پہلی تعبیر، جوش سے طبیعت میں گریہ طاری ہوگیا، ہم دونوں روتے جاتے تھے، رب ذوالجلال کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے جاتے تھے، اور اس کے فضل و بخشش کے لئے زبان پر دعا تھی سرسید مجھ سے اصرار کرتے تھے کہ میں سنگِ بنیاد رکھوں، اور میں سرسید سے اصرار کرتا تھا، آخر میں سرسید کا اصرار غالب آگیا، میں نے انتہائی رقتِ قلب کے ساتھ یہ فریضۂ مسعود انجام دیا۔"[2]

جس ادارہ کی بنیاد رکھنے والوں نے قلب کی اس رقت کے ساتھ رکھی ہو، اور اس مسعود وقت میں رکھی ہو جب کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سائلوں کو پکارا جا رہا ہو، پھر بتایا جائے کہ اس خدمت کی قبولیت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے، اللہ اللہ کیسا اخلاص ہے، روتے جا رہے ہیں اور اپنے گناہوں

---

[1] علی گڈھ نمبر ص ۲۴۵ [2] ایضاً ص ۲۴۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا اعتراف کرتے جا رہے ہیں، خدا جانتا ہے ایسی بُنیاد کبھی بے ثمر نہیں ہو سکتی، آج مسلم یونیورسٹی کی ساری کامیابی انھی بزرگوں اور مخلصوں کی نالۂ صبحگاہی اور گریۂ و بکائے نیم شبی کا نتیجہ ہے، کیسے بتاؤں کہ اب یہ سوز و گداز، یہ خلوص و للّٰہیت عنقا ہے، آدمی کی زبان پر تو سب کچھ ہوتا ہے مگر اس کے دل میں کوئی زیح نہیں ہوتا، خدا گواہ ہے آج ہماری ناکامیابی کی بُنیادی وجہ یہی اخلاص و للّٰہیت اور خضوع و خشوع کا فقدان ہے۔

ہمارے علیگ بھائی اس واقعہ کو بار بار پڑھیں اور سوچیں ان کے اسلاف میں خشیتِ الٰہی کیسی رچی ہوئی تھی، آہ یہ بے لوث خدمت کا جذبہ، قوم کے ساتھ ایسی والہانہ محبت اور اپنی ذلت و مسکنت کا رب العزت کے آگے اس طرح اعتراف اب پچھلوں میں کہاں رہا؟ کاش ہم سمجھتے اور سچائی سے سوچتے،

مولوی سمیع اللہ کا خلوص علی گڑھ کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے لایق ہے، بعد میں سر سید اور مولوی سمیع اللہ مرحوم میں اختلاف اس حد تک بڑھا کہ ترکِ تعلقات کی نوبت آگئی، مگر با ایں ہمہ مولوی سمیع اللہ مرحوم نے کالج کی کبھی برائی نہ چاہی، مولوی بشیر الدین صاحب ہی کا بیان ہے۔

"اس افسوسناک صورت حال کے بعد مولوی سمیع اللہ کالج کے انتظامی امور سے بہت حد تک دست کش رہے، لیکن کالج کے ساتھ ان کی ہمدردیاں اس دور میں بھی باقی رہیں، کالج کے جو طلبا ران سے ملنے جاتے تھے دل کھول کر ان کی مدد کرتے، ان کو بہت مخلصانہ مشورہ دیتے اور خیر و ترقی کی تلقین فرماتے"[1]

میں اپنے علیگ بھائیوں سے ہی پوچھتا ہوں کہ وہ ایمان داری سے بتائیں کہ کیا یہ جذبہ اب ہمارے بڑوں میں باقی رہا؟ اور کیا اب بھی نیک نیتی کا وہی عالم ہے جو ہمارے پہلوں میں تھا؟ اب تو بصد حسرت و افسوس کہنا پڑتا ہے کہ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔

محسن الملک نے سر سید مرحوم کا ایک عجیب پُراثر واقعہ بیان کیا ہے، جس کے راوی مولوی بشیر الدین صاحب ہیں فرماتے ہیں۔

---

[1] علی گڑھ نمبر ۲۵۵

© rasailojaraid.com

©rasailojaraid.com

"یہ واقعہ انھوں نے مجھے خود بتایا ہے، سرسید سے خاصی بحث رہی، رات میں سو رہے تھے کہ گریہ و زاری کی آواز آئی دیکھا تو معلوم ہوا سید احمد خاں رو رہے ہیں، پوچھا کیا گھر سے کوئی تار آیا ہے، سرسید نے جھلا کر جواب دیا کہ پوری قوم تباہ ہو گئی اور تم پوچھتے ہو گھر سے کوئی تار آیا ہے"[1]

اس سوز و گداز کو ملاحظہ فرمایئے، رات کی تنہائی میں قوم کی بربادی پر رونے والا، اور ملت اسلامیہ کی تباہی پر آنسو بہانے والا اگر کامیاب نہ ہوتا تو پھر دنیا میں کون کامیاب ہوتا، سرسید مرحوم کے اسی خلوص اور سوز و گداز کا نتیجہ تھا کہ رب العزت نے اسے ہر طرح کی کامیابی عطا فرمائی، اور ہر طرح کی عزت سے نوازا۔

اس واقعہ میں ہمارے مہذب لیڈروں اور متمدن جوانوں کے لئے بڑا عبرت آموز سبق ہے، کاش وہ پڑھیں اور اثر قبول کریں۔

وقار الملک کا حصہ علی گڈھ کے قیام میں کسی سے کم نہیں، ان کی بڑی خوبی حق گوئی تھی کبھی اس سلسلہ میں رو رعایت نہ کی، عموماً رائے میں سرسید کے مخالف رہتے، کیوں کہ وقار الملک میں مذہبیت اور آئین و ضابطہ کی پابندی بہت تھی، لکھا ہے

"سرسید کا انتہائی احترام کرنے کے باوجود انھوں نے اپنی رائے میں فرق نہ آنے دیا، اور کھلے طور پر ان کی مخالفت کی، البتہ یہ ان کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ جب اکثریت نے اس کو پاس کر دیا، تو انھوں نے انتہائی خندہ پیشانی سے سر تسلیم خم کر دیا"[2]

یہ وقار الملک کے اخلاص کی دلیل ہے، اپنا نقطۂ نظر پوری قوت سے پیش کرتے، مگر جب اکثریت نے اس کو نہ مانا تو پھر یہ اصرار نہ کیا، کہ یہی بات کیوں نہ ہوئی، ہمارے اس دور میں تو کچھ اور ہی معاملہ ہے، اگر کسی کی بات نہ رہی تو وہ ایک مخالف پارٹی کا روپ دھار لیتا ہے، اور یکسر ادارہ کی ہی مخالفت میں سرگرم عمل ہو جاتا ہے، آج کوئی غور کرنے کے لئے تیار نہیں کہ جو حق اس کو ہے کیا وہی حق اور لوگوں کو بھی حاصل ہے یا نہیں، اگر سب یہی کرنے

---

[1] علی گڈھ نمبر ص ۲۵ [2] ایضاً ص ۲۵۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لگیں تو ادارہ کا کیا حال ہو۔ اور غالباً اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارا کوئی اجتماعی ادارہ آج کامیاب نہیں ہوتا۔

وقار الملک کا ایک بڑا ہی مؤثر واقعہ مولوی بشیر الدین صاحب نے نقل کیا ہے فرماتے ہیں

"حیدر آباد میں ان (وقار الملک) کی کوٹھی میں ایک کوٹھری تھی، جس میں ایک اندھا فقیر رہتا تھا، اس کو کھانا نواب صاحب ہی کے مکان سے جاتا تھا، ایک دن زور کی بارش ہو رہی تھی، انھوں نے نوکروں سے کہا، کہ اندھے کو کھانا پہنچا دیا جائے، بارش کے سبب نوکروں نے تعمیلِ ارشاد میں تامل کیا، اور گویا بات ٹال گئے، نواب صاحب (یعنی وقار الملک) خاموشی سے اُٹھے، کھانا لے کر اس اندھے کے پاس گئے، اور بڑی محبت سے اسے کھانا کھلایا۔"[1]

یہ اخلاق تھا نواب صاحب کا، جو کسی اعتبار سے آج کل کے کسی رئیس اور تعلیم یافتہ سے کم نہ تھے، جو کام ان کے نوکروں پر بار تھا، اسے خود بہ نفس نفیس کیا، اور کس دل جمعی سے کیا کہ کوئی بار محسوس نہ کیا، اور یہ خدمت بھی کس کی کی؟ ایک اندھے فقیر کی۔

غور فرمائیں آج کوئی مالدار تعلیم یافتہ ایسی خدمت کے لئے اپنے آپ کو تیار پاتا ہے، خدا گواہ ہے خاص خاص لوگوں کو چھوڑ کر یہ جذبہ "فقیر نوازی" عنقا ہو چکا ہے، آج کا مہذب طبقہ دوسری دنیا کا انسان ہے، اسے انسانی ہمدردی چھو نہیں گئی ہے، ہمارے اس دور میں یہ خدمت ننگ و عار کے مرادف سمجھی جائے گی، ایک ادنیٰ کا کام اعلیٰ کرے؟ کیسے ہو سکتا ہے، اب تو مالدار اپنے سگے غریب بھائی سے ملنا اپنی ذلت سمجھتا ہے، ایک گریجوٹ بھائی، اپنے جاہل بھائی کو منہ لگانا سب سے بڑا گناہ جانتا ہے، مگر یہ حضرات سوچتے نہیں کہ یہ اخلاقی بلندی نہیں انتہائی گراوٹ ہے ——— اور بڑوں کی بات تو جانے دیجئے آج ایسی "فقیر نوازی" کو معمولی انسان بھی اپنے لئے عار جانتا ہے۔

انھی وقار الملک کا ایک اور واقعہ سننے کے لائق ہے جس سے ان کی مذہبیت کا اندازہ

---

[1] علی گڈھ میگزین علی گڈھ نمبر ۲۵۴

© rasailojaraid.com

©rasailojaraid.com

ہوتا ہے، ساتھ ہی ان کی انصاف پسندی اور عدل پروری کا، راوی مولوی بشیر صاحب ہی ہیں فرماتے ہیں

"وقار الملک نے اپنے لڑکے کو ندوہ میں داخل کرا دیا تھا، میں نے پوچھا کہ آپ نے ندوہ میں کیوں داخل کرا دیا کہنے لگے کچھ مذہبیت آجائے گی، میں نے فوراً کہا آپ دوسروں کے لڑکوں کو علی گڈھ بلا کر لامذہب بناتے ہیں، چپ ہو گئے، لڑکے کو ندوہ سے بلا لیا اور علی گڈھ کالج میں نام لکھا دیا۔"[1]

طبیعت کی نیکی اور دل کی سچائی ملاحظہ فرما رہے ہیں، خواہ مخواہ بحث شروع نہ کر دی، بلکہ وہی کیا جو اس وقت ان کو کرنا چاہیئے، ساتھ ہی اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ خود علی گڈھ کے بانیوں کو احساس تھا کہ مسلمان لڑکوں میں جس دینی جذبہ کی ضرورت ہے وہ علی گڈھ میں رہ کر نہیں پیدا ہو سکتا، وہ جذبہ کسی دینی مدرسہ ہی میں پرورش پا سکتا ہے، مگر وقت کا تقاضا تھا جس کے پورا کرنے پر وہ مجبور تھے۔

اب سوچنا یہ ہے کہ کیا ہمارے رئیس، نواب اور مالداروں میں دینی تعلیم کا احترام باقی رہا، اب تو ان کی بسم اللہ ہی اے۔ بی۔ یا کَ۔ کھَ سے ہوتی ہے، حد یہ ہے کہ اب مسلمان اپنے بچوں کو ابتدائی دینی تعلیم دینا بھی ضروری نہیں سمجھتے، نہ نماز، روزہ کا مسئلہ بچہ کو سکھایا جاتا ہے، نہ نہانے دھونے کا، نہ قرآن پڑھنا سکھایا جاتا ہے اور نہ کلمہ اور اس کا معنی، نہ اسلامی تاریخ پڑھائی جاتی ہے اور نہ اسلامی معاملات و اخلاق، اور حد یہ ہے کہ آج مسلمانوں کے بچے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے بھی ناواقف ہوتے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

قاضی عبدالغفار صاحب نے لکھا ہے میں مولانا محمد علی جوہر کے اخبار "ہمدرد" کے کارکنوں میں شامل ہوا، تو "مصر" کے عنوان سے ایک اداریہ لکھنے کا حکم ملا، کتابیں دی گئیں، نوٹ لکھائے گئے دس بارہ دن محنت کی لیکن لکھ کر جب پیش خدمت کیا تو مولانا مرحوم نے چند ہی سطریں پڑھ کر بنا بنا لیا اور یہ کہہ کر مسودہ پھینک دیا۔

"یہ کیا فضولیات گھسیٹ کر لائے ہو"

---

[1] علی گڈھ میگزین علی گڈھ نمبر ۱۹۵۳ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھر ایک گھنٹہ سمجھاتے رہے، قاضی صاحب کا بیان ہے کہ دوبارہ لکھ کر پیش کیا۔ مگر یہ بھی خوب پسند نہ آیا۔ حکم ہوا تیسری مرتبہ کوشش کرو، میں نے پھر از سر نو ترتیب دیا، اب کی جب لے کر حاضر ہوا، تو پڑھا اور شوق سے پڑھا اور پورا مضمون پڑھ کر

"گلے سے لگا لیا، تعریفوں کے پل باندھ دیئے، پہلے جس قدر اُن کی تنقید سے شرمندہ ہوا تھا، اب ان کی توصیف سے شرمندہ ہو گیا معلوم ہوا کہ تنقید کی تلخی ہی میں شہد اور دودھ کی لبریز نہریں بہا کرتی ہیں ہفتوں میرے مضامین کی تعریف ہوتی رہی"[1]

ملاحظہ فرمایا جائے کہ ہمارے پہلے والے کس طرح اپنے عزیزوں کو تعلیم دیا کرتے تھے، اور اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ بڑے اچھے اچھے ادیب مضمون نگار پیدا ہوئے، اب تو کوئی مسودہ دیکھنے والا ہی نہیں ملتا، جس کو دیجئے وہ کہیں ڈال دے گا، اور ہفتوں مہینوں بلکہ سالوں بعد جا کر پوچھئے۔ جواب دے گا کیا کروں موقع نہیں ملا۔ اور یہ کام آپڑا، اور ایسا ہوا، بس غلط عذروں کی بھرمار کر دیں گے۔ نوجوانوں کی تربیت کرنا لوگ جانتے ہی نہیں۔ ہندوستان کے علمائے کرام میں یہ امتیاز غالباً صرف حضرت علامہ گیلانی مدظلہ کو حاصل ہے کہ ان میں کبھی ذرا سی سستی دیکھنے میں نہ آئی۔ کوئی علمی مضمون اسلام کے لئے دے دیجئے، پڑھتے جائیں گے اور بولتے جائیں گے، معلوم ہوگا کوئی سمندر ہے جو جوش زن ہے، انگریزی دانوں میں چند ہی افراد نکلیں تو نکلیں۔ اس سلسلہ میں اپنا کوئی تجربہ نہیں۔

آخر میں اپنے محترم دوست سید علی امام صاحب (علیگ) کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی وجہ سے میں ان واقعات کو پڑھ سکا۔

[1] علی گڑھ نمبر صفحہ

رہنمائے قرآن

اسلام اور پیغمبر اسلام صلعم کے پیغام کی صداقت کو سمجھنے کے لئے اپنے رنگ کی یہ بالکل جدید کتاب ہے، جو خاص طور پر غیر مسلم یوروپین اور انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب کے لئے لکھی گئی ہے۔ جدید ایڈیشن۔ قیمت ایک روپیہ

© rasailojaraid.com